تجدید مذہب کے مقاصد اور اُسکی ذمّہ داریاں

عبد الحمید صدّیقی

"پل صراط" جس سے گزر کر انسان آخرت میں فائز المرام ہوتا ہے اس کے متعلق عام تاثر یہی ہے کہ وہ تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے۔ اُخروی زندگی کی سرحد شروع ہونے سے پہلے اگر کوئی کام "پل صراط" عبور کرنے کی طرح اہم نازک اور صبر آزما ہے تو وہ تجدید دین کا کام ہے۔

ان دونوں میدانوں میں انسانوں کو غیر معمولی حزم و احتیاط کے ساتھ قدم اٹھانے پڑتے ہیں اور ذرا سی بھی بے احتیاطی اُسے ناکام و نامراد بنا دیتی ہے۔ اگر آپ ان دونوں مراحل کی نوعیت پر غور کریں تو آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ان میں ایک طرف تو کسی شخص کو صبر و ثبات کے ساتھ قدم آگے بڑھانے پڑتے ہیں اور دوسری طرف اسے توازن برقرار رکھنا پڑتا ہے۔ اگر ان میں سے کسی ایک پہلو میں بھی کوئی لغزش ہو جائے تو بڑے تباہ کن نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

آئیے اب یہ دیکھیں تجدید دین کے سلسلے میں ایک مجدّد کو کونسی دشواریاں پیش آتی ہیں۔

(۱) ایک مجدّد کے لیے سب سے دشوار مرحلہ وقت کے تقاضوں سے کامیابی کے ساتھ نبرد آزما ہونا ہے۔ زندگی رواں دواں ہے اور ہر روز جو آفتاب دنیا پر طلوع ہوتا ہے وہ اپنے ساتھ کچھ نئے مسائل لاتا ہے۔ اگر زندگی میں ٹھہراؤ اور سکون ہوتا تو تجدید مذہب کی کوئی ضرورت پیش نہ آتی لیکن زمانے کے ہر آن بدلتے ہوئے تقاضے مذہب کے علمبرداروں سے ہر لمحہ اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ نئے اُبھرنے والے مسائل کو مذہب کی روشنی میں کامیابی کے ساتھ حل کیا جائے۔ تجدید مذہب کا کام اسی صورت میں پایۂ تکمیل تک پہنچایا جا سکتا ہے کہ سب سے پہلے نئے مسائل کی اہمیت اور نوعیت کا صحیح اندازہ لگایا جائے پھر معاشرے پر اُن کے اثرات کا تجزیہ کر کے اُن کے چیلنج کو جرأت، حوصلہ مندی

اور تدبّر کے ساتھ قبول کیا جائے۔

وقت کے ان نئے تقاضوں کے مقابلے میں اہلِ مذہب نے عام طور پر جو مختلف طرزِ عمل اختیار کیے ہیں انہیں تین حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) ایک طبقے نے تو سرے سے نئے اُبھرنے والے مسائل کی اہمیت اور اُن کے وزن کو یکسر نظر انداز کیا۔ اس طبقے سے تعلق رکھنے والے حضرات نے ہر نئی چیز کو بدعت اور ہر نئی بات کو کفر کہکر اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔ اور جہاں جہاں لوگوں کو مذہب سے انحراف کرتے ہوئے دیکھا انہیں "دردناک عذاب" کی وعید سنائی اور جہاں اُن کا بس چلا وہاں جبر کے ساتھ انہیں نئی روش کو اختیار کرنے سے منع کیا۔ یہ مذہبی طبقہ جسے اسلاف کی مقدس روایات کا امین ہونے کا دعویٰ ہے، اپنی نیکی، پاکبازی، دین کے ساتھ گہری محبت اور اپنی مذہبیت کے باوجود جاہلیت کے سیلاب کو روکنے میں ہمیشہ ناکام رہا ہے۔ دنیا میں جب نئے مسائل کا طوفان امنڈتا ہے تو اُسے محض الفاظ کی یورش سے روکا نہیں جا سکتا۔ اس کے لیے سب سے بڑی ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ ان مسائل کا تجزیہ کر کے لوگوں کو بتایا جائے کہ ان میں حق و صداقت کا کتنا حصّہ ہے اور باطل کی کس قدر آمیزش ہے۔ جب تک آنے والے مسائل کو اچھی طرح سمجھ کر اُن کے حل کی صحیح راہ معلوم نہ کی جائے محض کفر و الحاد کے فتوے لگانے سے تو کام نہیں بن سکتا۔

یہ درست ہے کہ ہر عہد کے سارے تقاضے ہی اتنے اہم نہیں ہوتے کہ ان سے صرفِ نظر نہ کیا جا سکے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض مسائل بڑے سنگین ہوتے ہیں اور اُن سے اغماض برتنا بڑی کوتاہ اندیشی ہوتی ہے۔ اگر شتر مرغ طوفان کے آثار دیکھ کر ریت میں منہ چھپا لے یا کبوتر بلّی کی حریص نگاہوں پر نظر ڈالنے کے بعد اپنی آنکھیں بند کر لے تو اس سے نہ تو طوفان کا خطرہ ٹل سکتا ہے نہ بلّی اس کی اس بے بسی کو دیکھ کر اس پر جھپٹنے سے باز رہ سکتی ہے۔ یہی حال جاہلیت کے طوفانوں یا کفر و الحاد کی یورشوں کا ہے۔ یہ طوفان اور یہ حملے صرف خیالات و تصورات کی دنیا ہی میں ہلچل پیدا نہیں کرتے بلکہ مذہبی تہذیب کی جڑیں ہلانے کی کوشش کرتے ہیں اس لیے ان کے معاملے

میں محض کفر سازی یا فتوے بازی یا غم و غصے کا اظہار انہیں ٹال نہیں سکتے۔ اس حقیقت کا آپ ماضی سے نہیں بلکہ حال کے واقعات سے اندازہ لگائیں۔

دورِ حاضر کی مادی تہذیب ایک خاص نصب العین اور ایک مخصوص نظریۂ حیات لیکر اٹھی ہے اور اس نے پوری دنیا کی سیاسی، معاشی، معاشرتی، مذہبی، اخلاقی اور روحانی زندگی کو شدید طور پر متاثر کیا ہے۔ چونکہ یہ تہذیب مذہب کے غلط تصور کے نتیجے میں ابھری ہے اس لیے اس کا آغاز ہی باری تعالیٰ کے قادرِ مطلق ہونے کی نفی اور مادہ کی خدائی کے اعتراف و اقرار سے ہوا ہے۔ اس میں بنیادی طور پر انسان کے اندر اس باطل خیال کو راسخ کیا جاتا ہے کہ مادہ کی یہ محدود دنیا ہی سبھی کچھ ہے۔ حرکت، نمو، خمیر، سب مادہ کی ترقی یافتہ صورتیں ہیں۔ جس طرح کائنات کے مختلف شعبے قوانینِ طبیعی کے پابند ہیں اور وہ اضطراری طور پر ایک خاص روش پر چل رہے ہیں بالکل اسی طرح انسان سے بھی خود بخود ایک خاص نوعیت کے افعال سرزد ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس بنا پر کوئی اخلاقی قدر بھی کسی مستقل حیثیت کی حامل نہیں۔ اخلاقی اقدار حالات و واقعات کے تحت بدلتی رہتی ہیں۔ لہٰذا خیر و شر کے تصورات، حلال و حرام کی تمیز، خوب و ناخوب کے معیار، ثواب و گناہ کے نظریات سب اضافی چیزیں ہیں جو زمان و مکان کے تابع ہیں۔ وقت اور حالات بدلنے کی وجہ سے ان میں خود بخود تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ خیر و شر کا یہ اضافی تصور مذہب کی عین ضد ہے۔ مذہب کی پوری عمارت ہی اس بنیاد پر قائم ہے کہ باری تعالیٰ کی تعلیمات زمان و مکان کی پابند نہیں وہ مستقل اور پائیدار ہیں اور انسان اپنے آپ کو، اپنے حالات کو اور اپنے گرد و پیش کو اُن کا پابند بنانے کا مکلف ہے۔

یہ تصور مذہب کے لیے ایک شدید چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ اب یہ باطل نظریہ جس کی تائید کے لیے ایک غلط فلسفہ گھڑا گیا ہے، اور غلط تاریخی شواہد مہیا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ہر سوچنے سمجھنے والے دماغ کو متاثر کرتا ہے۔ ہمارے اس دور میں نئے انداز پر جتنی تاریخی کتب لکھی گئی ہیں وہ سب اسی غلط نظریہ کی شارح و ترجمان ہیں۔ ہمارے ذہنوں میں بالکل غیر محسوس طور پر یہ خیال راسخ کیا جا رہا ہے کہ عہدِ رعائی (PASTORAL STAGE) میں خدا کا تصور اور

اخلاق کے تصورات اُس مخصوص دَور کی پیداوار تھے۔ پھر جب انسانیت عہدِ زراعت (AGRICULTURAL STAGE) میں داخل ہوئی تو یہ تصورات اُس دَور کے بدلے ہوئے تقاضوں کے ساتھ خود بخود بدل گئے۔ اس کے بعد دستکاری کے دَور میں ان میں پھر تبدیلی ہوئی اور سرمایہ دارانہ نظام نے اپنے بطن سے خدا کے نئے تصور اور حق و باطل کے نئے نظریہ کو جنم دیا۔

اسی طرح معاشرتی مسائل کو دیکھیے۔ ان کے بارے میں بھی اس تہذیب نے لوگوں کے اندر یہ عام احساس پیدا کیا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی مستقل اخلاقی قدر و قیمت کا حامل نہیں بلکہ وقت اور حالات کے ساتھ اُن کی افادیت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ مثلاً عہدِ رعائی میں گلہ بانی کے لیے زیادہ سے زیادہ افراد درکار ہوتے تھے۔ اس لیے کثرتِ اولاد ایک رحمت تھی۔ یہی حال عہدِ زراعت اور عہدِ دستکاری میں رہا۔ لیکن دورِ جدید میں جبکہ مشینوں کی فراوانی نے انسانی محنت کی افادیت غیر معمولی حد تک کم کر دی ہے، اولاد کی کثرت رحمت کی بجائے زحمت ہے۔

یہی حال سُود کا ہے۔ پہلے ادوار میں تجارت کا یہ انداز نہ تھا جو آج ہمیں نظر آتا ہے۔ ہر شخص اپنی محنت اور سرمایے سے کام کرتا تھا اور اگر وہ کبھی کوئی چیز دوسرے سے مستعار لیتا تھا تو وہ یہ کام شدید مجبوری کے عالم میں کرتا تھا اس لیے حق و انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ سُود کی حوصلہ شکنی کی جاتی۔ چنانچہ اہلِ مذہب نے اسے حرام قرار دیا۔ لیکن آج روپیہ نفع بخش کاموں میں لگانے کے لیے دوسرے سے مستعار لیا جاتا ہے۔ اگر یہ نہ کیا جائے تو وسیع پیمانے پر اشیاء کی پیدائش کا انتظام ممکن نہیں کثیر پیداآوری اور زود پیداداری کے لیے سرمایے کی زیادہ سے زیادہ تعداد بنیادی ضرورت ہے۔

سرمایے کی اس غیر معمولی اہمیت نے دولت کے سارے تصورات کو بدل دیا ہے۔ فقر و استغناء، مال و متاع کو آزمائش سمجھ کر اس کے بارے میں حزم و احتیاط، جو مذہبی زندگی کے بنیادی لوازم ہیں، اُن کے بارے میں لوگوں کے فکر و نگاہ کے زاویے یکسر بدل گئے اور دورِ جدید میں انسان نے دولت کو قاضی الحاجات سمجھ کر اس کی پرستش شروع کر دی ہے۔

ان حالات میں کون سا ایسا شخص ہے جو ان حقائق کو نظر انداز کر سکتا ہے۔ جن بے جان

سکوں کی محبت نے لوگوں کو خدا کی محبت سے غافل کر دیا ہے اور عز و شرف کی ساری قدروں کو بدل کر رکھ دیا ہے ان کے بارے میں کبھی اغماض نہیں برتا جا سکتا۔ اس مسئلہ کو جب تک صحیح طور پر حل نہ کیا جائے اس وقت تک مذہب کی دعوت لوگوں کے لیے اپنے اندر کوئی کشش نہ رکھے گی۔

محض یہ بات کہہ دینے سے کہ سُود حرام ہے یہ پیچیدہ مسائل حل نہیں ہونگے۔ انسان کو جب تک ان کا کوئی خاطر خواہ اور معقول حل نظر نہ آئے اس وقت کوئی دعوت بھی اُسے اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی۔ سُود واقعی حرام ہے، یہ ایک سنگین معاشرتی اور معاشی برائی ہے، اس نے مزدوروں کے جسم سے خون کا آخری قطرہ نچوڑ لیا ہے۔ اس نے کساد بازاری، بے روزگاری، طبقاتی منافرت کو جنم دیا ہے لیکن عوام کو یہ حقائق باور کرانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم سب سے پہلے مغرب کے مختلف معاشی نظاموں کو سمجھیں۔ ان کے اندر جو خامیاں ہیں انہیں طشت از بام کریں اور عملی واقعات سے اُن کی مضرتیں ثابت کریں۔ پھر ان نظاموں کے مقابلے میں اُس نظام کا نقشہ پیش کریں جو ہمیں مذہب نے دیا ہے اور دلائل سے واضح کریں کہ اگر اس نقشے کے مطابق معاشی نظام کی تشکیل کی جائے تو وہ انسانیت کے اخلاقی، روحانی اور مادی تقاضوں کو بطریقِ احسن پُورا کر سکے گا۔

اس ضمن میں یُوں تو بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں مگر میں صرف دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ انسان کی روحانی اور اخلاقی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ اجتماعی اور معاشی جکڑ بندیوں سے کافی حد تک آزاد ہو۔ مذہب چونکہ بنیادی طور پر ایک قلبی کیفیت کا نام ہے اس لیے اس میں خارجی محرکات سے کہیں زیادہ داخلی محرکات انسان کو سرگرمِ عمل کرتے ہیں۔ اس بنا پر مذہب سب سے پہلے "اندر کے انسان" کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوتا ہے لیکن اس وقت مغرب نے ہم پر جو معاشی اور معاشرتی نظام مسلط کیا ہے اس میں انسان اجتماعی جکڑ بندیوں کے ہاتھ میں بالکل بے بس ہو کر رہ گیا ہے اور حیاتِ اجتماعی کا تند و تیز دھارا اُسے غیر ارادی طور پر جس طرح چاہتا ہے بہا کر لے جاتا ہے۔ وہ بیچارا اپنے لیے اپنی پسند کے مطابق رزق تلاش نہیں کر سکتا۔ اس کا اثر یہ ہوا ہے کہ وہ حضرات جو رزقِ حلال کے حصول کے انتہائی آرزومند ہیں وہ بھی اس مقدس آرزو کو صرف سینوں میں پالنے

پر اکتفا کرتے ہیں اور عملی زندگی میں اسی حرام سے پیٹ بھرنے پر مجبور ہوتے ہیں جو خدا کے باغی ناجائز طریقوں سے حاصل کرتے ہیں۔

اب اگر تجدید و احیائے دین کا کوئی علمبردار اجتماعی زندگی کی ان جکڑ بندیوں اور ان کے اخلاقی مفاسد کو نظر انداز کر کے عوام کو مذہبی طرز زندگی اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اُسے اپنی اس مقدس دعوت کے ساتھ ساتھ ان مفاسد پر بھی ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے کہ وہ ان جکڑ بندیوں کو کس طرح ڈھیلا کر سکتا ہے تاکہ لوگوں کے ضمیر اور ان کی رُوح آزاد ہو اور وہ خارجی دباؤ کے تحت نہیں بلکہ باری تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے رزقِ حلال کی تلاش کریں اور حرام خوری سے دستکش ہوں۔

دوسری مثال پردہ کی ہے آج مسلمانوں میں بے پردگی کا جو خطرناک رجحان بڑھ رہا ہے اُسے اس ملت کے سارے دردمند افراد بڑی تشویشناک نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں اور بجا طور پر یہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر مغربیت کے اس سیلاب نے ایک مرتبہ اُن کی عائلی زندگی کو برباد کر دیا تو پھر اس ملت کو سنبھلنے میں صدیاں لگیں گی۔ عورت مرد کے مقابلے میں زیادہ جذباتی ہوتی ہے اور وہ اگر ایک دفعہ گھر سے نکل آئی تو پھر اُسے گھریلو ذمہ داریاں قبول کرنے پر آسانی سے آمادہ نہ کیا جا سکے گا اور یہاں بھی اخلاقی بے راہ روی کا وہی طوفان امڈ آئے گا جس نے آج مغربی زندگی کو دردناک عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ یہ احساس اپنی جگہ صحیح اور درست ہے اور جن خدشات کا اظہار کیا جا رہا ہے وہ بھی بے پردگی کے ناگزیر نتائج ہیں۔ لیکن یہ سوچیے کہ کیا ہم اپنے معاشی، سیاسی اور معاشرتی ڈھانچے کو جوں کا توں رکھ کر محض وعظ و تلقین سے اس طوفان کو روک سکتے ہیں۔ ہم پر آہستہ آہستہ جو معاشی نظام اپنا تسلط قائم کر رہا ہے بے پردگی، آوارگی اس کا فطری نتیجہ ہے۔ اس نظام میں ایک مختصر سا طبقہ تو دن بدن امیر ہوتا چلا جا رہا ہے مگر دوسری طرف انسانوں کی عظیم اکثریت اتنی مفلوک الحال ہو گئی ہے کہ اس کے لیے جسم و جان کے رشتے کو برقرار رکھنا انتہائی مشکل ہو گیا ہے۔ چنانچہ ان حالات میں نہ صرف مرد بلکہ عورت بھی اس بات پر مجبور ہے کہ وہ کمائے اور کسی دوسرے

پر بار نہ بنے۔ اس سرمایہ دارانہ نظام میں گھر کی چار دیواری کے اندر بیٹھ کر عزت و آبرو کے ساتھ کمانے کی کوئی معمولی گنجائش بھی باقی نہیں رہی۔ اُسے رزق کی تلاش میں بڑے بڑے کارخانوں اور تجارتی مراکز کا رُخ کرنا پڑتا ہے اور وہاں بے بس غلام بن کر چند سکوں کے حصول کے لیے محنت و مشقت اٹھانا پڑتی ہے۔ ان حالات میں اگر ایک عورت باپردہ رہنا بھی چاہے اور عزت و آبرو کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا عزم صمیم بھی کرے تو وہ کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ چند بامت خواتین اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو جائیں لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ طبقۂ نسواں کی عظیم اکثریت اجتماعی دباؤ کے سامنے جھکنے پر مجبور ہو گی اور وہ دین کی ان ساری قدروں کو اسی طرح پامال کریگی جس طرح کہ انہیں مغرب میں پامال کیا گیا ہے اور اس معاملے میں کوئی بڑی سے بڑی دردمندانہ نصیحت بھی کارگر ثابت نہ ہو گی۔

یہ چند مثالیں جو اوپر پیش کی گئی ہیں کوئی ایسی ڈھکی چھپی نہیں کہ ان کی نوعیتوں اور ان کے وسیع اثرات کو سمجھنے کے لیے کوئی غیر معمولی بصیرت اور ذہانت درکار ہو۔ یہ وہ تلخ حقائق ہیں جن سے ہر فرد پوری طرح واقف ہے اور جن کی تلخیوں کو ہر شخص اپنی زندگی میں بڑی شدت کے ساتھ محسوس کر رہا ہے مگر بے بس ہونے کی وجہ سے خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔

ہم نے ماضی میں سے چند مثالیں دینے کی بجائے زمانۂ حال کے کچھ واقعات صرف اس لیے درج کیے ہیں کہ تجدید و احیائے دین کے کام کی نوعیت اور اس کی بھاری ذمہ داریوں کی نزاکت کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ جب جاہلیت کسی قوم پر یلغار کر کے اُس کے پورے نظامِ زندگی میں سرایت کر جائے تو اس وقت سب سے پہلے جاہلیت کے زور کو توڑنے کے لیے اُس کے ساتھ پنجہ آزمائی کرنا پڑتی ہے اور یہ کام اُسی صورت میں کیا جا سکتا ہے جب ہمیں اس کی قوت کا پوری طرح اندازہ ہو، اس کے کمزور محاذوں کا اچھی طرح علم ہو، اس کے حملوں کی تکنیک اور اس کی سازشوں کے انداز سے پوری پوری واقفیت ہو اور پھر اس قوت کا مقابلہ کرنے کا عزم، اُس سے نبرد آزما ہونے کا

حوصلہ اور تدبّر ہو۔ وقت کے تقاضوں کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ ایک مجدّد کو اُس دین اور مذہب کے اندر بھی گہری بصیرت حاصل ہونی چاہیے جس کی تجدید کا عزم لیکر وہ اٹھتا ہے کیونکہ اگر وہ اس دین اور مذہب کے مقصد و منہاج، اُس کے مزاج، اس کے تاریخی ارتقاء کو کما حقہٗ نہیں سمجھتا تو وہ تجدید کے نازک فرض کو حسنِ نیت اور اخلاص کے باوجود بخوبی سرانجام نہیں دے سکتا۔ اس ضمن میں اُس کے لیے ان چند امور کا اچھی طرح جاننا انتہائی ضروری ہے۔

(۱) تعلیماتِ الٰہی کے ماخذ پر ایک مجدّد کی نہایت گہری نظر ہونی چاہیے۔ مذہب خواہ کوئی ہو اُس کے ماخذ بالعموم دو ہی ہوتے ہیں۔ ایک الہامی کتاب اور دوسرے جس مقدس ہستی پر وہ کتاب نازل ہوئی ہے اس کا اپنا عمل، کیونکہ اس کا یہ عمل ہی کتاب الٰہی کی صحیح تفسیر و تعبیر ہوتی ہے اور یہ بھی دین میں اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے جتنی کہ خود کتاب اللہ۔ اس تعبیر سے ایک طرف اللہ کے دین کو عملی زندگی میں نافذ کرنے کے لیے ہدایت اور رہنمائی ملتی ہے اور دوسری طرف فکر و نگاہ کے وہ زاویے اور احساسات و جذبات کے وہ پیکر بنتے ہیں جو دین ترتیب و تشکیل دینا چاہتا ہے۔ ایمان، خالق و مالک، کائنات اور ابنائے نوع کے بارے میں ایک خاص نقطۂ نظر اور ایک مخصوص قلبی کیفیت کا نام ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب تک ایک انسان فکر و نظر اور جذبہ و احساس کی یہ حالت پیدا نہیں کر لیتا اس وقت تک وہ دین اور اس کے مطالبات اور اُس کے تقاضوں کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکتا۔ اور یہ چیز دین کے سرسری سے مطالعہ سے تو پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ انسان عقلِ سلیم اور مومنانہ بصیرت کے ساتھ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ کا اتنی گہری نظر سے مطالعہ کرے کہ نہ صرف اُس کے قلب و نگاہ دین کے نور سے منور ہو جائیں بلکہ یہ نور اس کے ضمیر، اس کے وجدان اور اس کے احساس میں پوری طرح سرایت کر جائے اور جہاں کہیں اُسے باطل کی کوئی تاریکی نظر آئے تو اس کی روشن ضمیری فوراً اس کا ادراک کرے۔

یہ مقام صرف مذہب کے ماخذ کی زبان جاننے اور اس کے سطحی مطالعہ سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

اس کے حصول کے لیے دین کی سچی محبت، اُسے اپنانے اور دنیا میں سربلند کرنے کا جذبۂ صادق اور اسی وجہ سے اُسے سمجھنے کی گہری آرزو نہایت ضروری ہے۔

امام شافعیؒ نے جو بات مفتی کے بارے میں ارشاد فرمائی ہے وہی بات مجدّد کے لیے بھی ضروری ہے:

"خدا کے دین میں فتویٰ دینا صرف اُسی شخص کے لیے جائز ہے جو کتاب اللہ میں گہری بصیرت رکھتا ہو، ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ، تاویل و تنزیل، مکی و مدنی سورتوں کے پس منظر سے پوری طرح آگاہ ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ احادیثِ رسول کے بارے میں گہرا علم رکھتا ہو۔ لُغت، شعر اور ہر وہ چیز جو قرآن و حدیث کے سمجھنے میں کام آتی ہو اُن کا عالم ہو۔ اس کے علاوہ منصف مزاج اور متوازن ذہن کا ہو تاکہ حق و انصاف کے ساتھ کوئی رائے دے سکے۔ مختلف ممالک اور علاقوں کے باشندوں کے مزاج، عادات و اطوار کو بھی سمجھنے والا ہو (کیونکہ ان کے اندر جو فطری اختلاف پایا جاتا ہے اسے عملی زندگی میں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا) اور سب سے بڑھ کر استنباط و اجتہاد کا ملکہ رکھتا ہو۔"

(۲) اسی ضمن میں ابن مبارک سے ایک ایسا قول منقول ہے جو فہمِ دین کے صحیح معیار کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے یحییٰ بن اکثم سے دریافت کیا کہ مفتی میں دین کے معاملے میں کونسی خصوصیات ہونی چاہییں تو انہوں نے کہا: "حدیث کا حافظ اور رائے میں بصیرت رکھنے والا۔"

پھر انہوں نے رائے کی تصریح کرتے ہوئے فرمایا کہ اس سے مراد مصالح اور اُن علتوں کی پوری واقفیت ہے جن پر اللہ کی شریعت قائم ہے[۲]۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں اس موضوع پر باقاعدہ ایک

---

[۱] منقول از اعلام الموقعین تالیف حافظ ابن قیم۔ جلد اوّل ص ۴۶

[۲] ایضاً ص ۴۷ جلد اوّل

جامع باب تحریر فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ ان علتوں کو سمجھے بغیر احکامِ الٰہی سمجھے نہیں جا سکتے۔ ان کی تصریحات قابلِ غور ہیں:

"دینِ الٰہی میں کوئی شے عبث نہیں ہوتی۔ ان افعال کے ساتھ رضاءِ الٰہی یا اس کی ناراضگی کا تعلق ضرور کسی نہ کسی سبب کی وجہ سے ہوتا ہے اور اس کی شکل یہ ہے کہ ان افعال کے ساتھ درحقیقت کچھ ایسے امور اور علتیں وابستہ ہوتی ہیں جو باری تعالیٰ کی ناراضگی کا موجب بنتی ہیں۔ ان امور اور علتوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

- بر و اثم۔ نیکی اور گناہ یعنی وہ امور جو افراد اور معاشرے کی بھلائی اور برائی کے ذمہ دار ہیں۔
- دوسرے وہ امور جن کا مقصد دین کے اندر تحریف کا سدباب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے دین عوام کی ہدایت و رہنمائی کے لیے نازل فرمایا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ شرعی احکام کے پیچھے جو مصالح اور علتیں موجود ہیں وہ ایسی نوعیت کی ہوں جو آسانی سے ان کی سمجھ میں آ سکیں۔ مثال کے طور پر شراب نوشی کو اسلام میں جو حرام قرار دیا گیا ہے تو اس کے مفاسد اور خرابیاں اتنی واضح ہیں کہ انہیں ہر شخص جانتا ہے۔ شراب کا رسیا احسان اور نیکی سے دور ہو جاتا ہے۔ خالق اور خلق کے حقوق سے غفلت برتتا ہے۔ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ اس سے معاشرتی، تمدنی اور عمرانی نظام تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ یہ تمام امور اکثر و بیشتر شراب نوشی کے لوازمات ہیں اور اسی بنا پر شراب کی تمام اقسام سے منع کیا گیا ہے[1]۔"

یوں تو شرعی احکام کی علتوں کا جاننا ہر شخص کے لیے مفید ہے لیکن ایک مجدد کے لیے تو انتہائی ضروری ہے۔ مجدد کا کام مسند افتاء پر بیٹھ کر صرف فتوے صادر کرنا نہیں ہوتا بلکہ نظامِ شریعت کو عملاً نافذ کرنا بھی ہوتا ہے۔ اس تگ و دو میں اُس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ایک طرف لوگوں کے مزاج کو جانے، اُن کے اندر دین سے انحراف اور بغاوت کے جو رجحانات پیدا ہو چکے ہیں

[1] جزو اول ص ۹۳

اُن کی نوعیت اور ماہیت کو سمجھے اور پھر ان سارے حالات کو سامنے رکھ کر وہ طریقہ اختیار کرے جس سے لوگ بغاوت کی راہ ترک کرکے دین کی راہ اختیار کریں۔ ظاہر بات ہے کہ اس کام کو اُس آسانی کے ساتھ تو سرانجام نہیں دیا جا سکتا جس آسانی کے ساتھ کسی خالی جگہ پر خیمے کو گاڑا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے کسی مجدد کو دین و شریعت کے پُورے نظام پر ایک متوازن نگاہ ڈال کر سب سے پہلے اس امر کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ دین کے مختلف احکام کو جاری کرنے کے لیے تقدیم و تاخیر کی کونسی ترتیب قائم کی جائے۔ اس ترتیب میں مصالح اور علتوں کی گہری واقفیت نہایت ضروری ہے کیونکہ اگر کوئی شخص ان سے ناواقف ہے تو وہ اصول و فروع کے درمیان امتیاز نہیں کر سکتا اور اس طرح دین کے عملی نفاذ کے معاملے میں ٹھوکریں کھا سکتا ہے۔

(۳) مجدد کے لیے تیسری بڑی چیز خدا خوفی، نیکی، پرہیزگاری اور ملت کے اہلِ رائے کا اعتماد ہے۔ دین محض علم کا نام نہیں بلکہ اس میں عمل بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ علم۔ اگر ایک شخص اللہ کے دین کی تجدید کا دعویٰ کرتا ہے تو اس کی دعوت کی طرف لوگ اس وقت تک کبھی متوجہ نہ ہونگے جب تک کہ اُس کی زندگی میں وہ دین کی پُوری جھلک نہ دیکھ لیں کسی شخص کی محض دینی معلومات کی وسعت لوگوں کو اس کا عقیدتمند نہیں بنا سکتی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے لوگوں کو اس امر کا اطمینان ہونا چاہیے کہ یہ شخص جو تجدید دین کے لیے جدوجہد کر رہا ہے اُسے واقعی اللہ کے دین سے گہری محبت ہے، اپنے خالق و مالک پر یقین کامل ہے اور نبی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا سچا جذبہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ اس کی اس سعی و جہد کا مقصود کچھ ذاتی منافع یا عزت و شہرت کا حصول نہیں بلکہ محض مالک الملک کی رضا جوئی ہے۔ اپنے خالق و مالک کے ساتھ اس کا گہرا تعلق ہے اور وہ صرف اس کے اعتماد اور بھروسے پر اِس فرض کو سرانجام دے رہا ہے۔ تاریخ کے اوراق اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کا کام ننھی منی چڑیوں، جانوروں، ہواؤں سے تو لے لیا ہے لیکن کبھی بھی تمدن سے غافل لوگوں سے نہیں لیا۔ دین کی سب سے زیادہ خدمت اُنہی لوگوں نے کی ہے جو بڑے متقی، پرہیزگار، قانع، احکامِ الٰہی کے پابند اور مخلص تھے۔ مجرد وسعتِ علمی کو کبھی کوئی مقام حاصل نہیں ہوا۔ ابوالفضل اور فیضی کی وسیع علمی معلومات

اور اُن کی ذہانت و فطانت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ زبان پر انہیں عبور تھا، منطق اور فلسفہ کے یہ لوگ ماہر تھے۔ بات کرنے کا ڈھنگ انہیں آتا تھا لیکن اس کے باوجود مجددیت کی خلعت سے مجدد الف ثانی نوازے گئے۔ اس کی وجہ ایک ہی ہے کہ مجدد صاحب کے دل میں دین کی سچی تڑپ موجود تھی اور اُن کے مقابلے میں ابوالفضل اور فیضی کے سامنے بادشاہ کی خوشنودی اور اس کے نتیجے میں دنیاوی عزوجاہ اور مادی منافع کا حصول تھا۔ دین کی خدمت کا شرف انہیں خوش نصیب لوگوں کے حصے میں آیا ہے جنہوں نے دین کو ہی اپنی زندگی کا منتہائے مقصود اور گوہر مراد سمجھا ہے اور اسے کسی دوسرے مقصد کے لیے استعمال نہیں کیا۔ رب العزت کی غیرت نے اس دین کو بعض دوسرے مقاصد کے حصول کا کبھی ذریعہ نہیں بننے دیا۔ اگر کچھ لوگوں نے مختصر سے عرصے کے لیے معدودے چند لوگوں کو دھوکے میں مبتلا کر دیا تو جلد ہی اُن کی فریب کارانہ سرگرمیوں کا پردہ چاک کر دیا گیا۔ امتِ مسلمہ کی پوری تاریخ پر نگاہ ڈالیں اور دیکھیں کہ یہاں مختلف اوقات میں مختلف من چلوں نے دین کے اندر کس قسم کی رخنہ اندازیاں پیدا کرنے کی کوششیں کیں۔ ان میں بعض حضرات اپنی معلومات کے اعتبار سے اپنے ہمعصروں میں ممیز و ممتاز تھے۔ لیکن ان میں سے کسی ایک شخص کے اجتہادات بھی عوام میں قبول نہ کیے جا سکے۔ جب ہم ان متجددین کی ناکامیوں کے اسباب پر غور کرتے ہیں تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات اس بنا پر ناکام رہے کہ عوام کو ان کی خدا خوفی، خلوص نیت اور دیانت پر بھروسہ نہ تھا۔

بعض لوگوں نے غلطی سے تجدید کو تجدد کا ہم معنی سمجھ لیا ہے اُن کے نزدیک تجدید کا کام اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ دین کے اندر ایسی نئی نئی باتیں نہ پیدا کی جائیں جن کا نہ تو پہلے کوئی نام و نشان ملتا ہو اور نہ اُس کے مزاج سے کوئی مناسبت رکھتی ہوں۔ مجددین کا انداز تجدد پسندوں سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ مجددین کے اندر کوئی نئی طرح نہیں ڈالتے بلکہ دین کی پرانی روایات اور تعلیمات کو وقت کے تقاضوں کے تحت نئے طرزِ استدلال کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔